پروفیسر سید وقار عظیم

سر سید رحمۃ اللہ

ہند کی سرزمین پر مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان کا زمانی بُعد تقریباً ۱۳ صدیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ ہندی مسلمانوں کی زندگی کی ان تیرہ صدیوں میں بے شمار مدّوجزر ہیں اور لاتعداد پیچ وخم۔ منزل پر سفر کو ترجیح دینے والے خضر کو مجاز اور سفر کو حقیقت سمجھنے والے کاروانِ شوق نے پست و بلند کی لذتوں سے آشنا ہو کر اور تڑپنے پھڑکنے کو سرمایۂ رحمت سمجھ کر اپنا سفر جاری رکھا

ہندی مسلمانوں کی دینی راسخ الاعتقادی کو اکبر اور جہانگیر کے سیاسی مسلک نے ضعف پہنچایا تو ایک دینی رہنما نے دارو گیر کی سختیاں جھیل کر عقیدے کو حیاتِ تازہ بخشی اور ہند میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا علمبردار ہو کر مجدد الف ثانی کا لقب پایا۔ مجدد الف ثانی کی سعی پیہم نے عقائد دینی کے احیا کی جو مشعل روشن کی تھی، اسے ان کے مسلک پر ایمان رکھنے والوں نے ان کے بعد بھی روشن رکھا اور اکبر اور جہانگیر کے عہد میں انھیں جو ضعف پہنچا تھا، اس میں شاہ جہاں کے عہد میں بحالی کے آثار پیدا ہوئے، لیکن اس عہد میں موافق اور مخالف گروہوں کے درمیان تصادم جاری رہا اور اورنگ زیب کے عزم صمیم اور یقین محکم نے مخالفتوں کے طوفان میں توازن کو قائم رکھا، لیکن اٹھارہویں صدی کے شروع میں اورنگ زیب کا انتقال ہوتے ہی تخریب و انتشار کی ساری چھپی، ڈھکی اور دبی ہوئی قوتوں کو سر اٹھانے اور زور دکھانے کا موقع ملا۔ امن و امان اور خوش حالی و فارغ البالی کی آغوش میں پرورش پانے والے مسلمان میں دین سے غافل کر دینے والی ان قوتوں کے مقابلے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ تن آسانی اور عیش کوشی اس کا مسلک بن گئی تھی۔ سازش اور خود غرضی کے ماحول نے سیاسی احساس اور سیاسی تفکر کو مفلوج کر دیا تھا اور الا ماشاء اللہ سرکار دربار میں تمسخر گی اور شہدگی پروان چڑھ رہی تھی۔ اس ساری صورت حال کا خلاصہ ایک تاریخی مبصر کے الفاظ میں یہ ہے کہ "جو ملّت سپاہی پیدا کرتی تھی، اب بانکے پیدا کرنے لگی اور

پیشہ ور سپہ سالار بھی پالکیوں میں سوار ہو کر میدان جنگ کی طرف جانے لگے۔"

ان حالات میں ملّت اسلامی کو ایک طبیب حاذق کی ضرورت تھی جو مرض کی تشخیص کر کے معالجے کی تدابیر سوچے اور مرض کے استیصال کا بیڑا اٹھائے۔ بحران اور اضطراب کے اس دور میں اللہ نے یہ خدمت نشأۃ ثانیہ کے اس خوش فکر اور خوش تدبیر قائد سے لی جس کا نام شاہ ولی اللہ تھا۔ جہاد اور جد و جہد کا جو در مسلمانوں پر عرصہ ہوا بند ہو چکا تھا، اس نے اس پر دستک دی اور اپنی قوتِ ایمانی کے زور سے اسے کھولا اور نشأۃ ثانیہ کا قافلہ ایک بار پھر اپنے سفر پر روانہ ہوا۔ شاہ ولی اللہ نے عدل و توازن کی اساس پر جس ضابطۂ اخلاق اور لائحۂ عمل کی بنیاد رکھی تھی، اس عظیم احیائی تحریک اور مسلک کے عالی مرتبت مصلحین اور مجاہدین شاہ عبدالعزیز، سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید نے زندگی کے سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی گوشوں میں اسے جاری رکھا، اور ان میں سے بعض نے اپنے مسلک کی پیروی میں جام شہادت پیا۔ یہی زمانہ ہے کہ سیاسی بے بسی نے شاہ دہلی کو انگریز کا وظیفہ خوار بنا دیا لیکن انقلاب کا جو شعلہ ولی اللہی تحریک نے روشن کیا تھا، وہ مسلمانوں کے دل میں اب بھی فروزاں تھا۔ انگریز کی کوشش تھی کہ وہ اس شعلے کو ہمیشہ کے لیے بجھا دے۔ مقاصد کے اس تصادم نے شک اور بے اعتباری کی ایسی فضا پیدا کر دی کہ انگریز اور مسلمان ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے اور بالآخر مایوسی اور لاچاری میں مسلمان کو اپنے لیے چلنے کی جو تنہا راہ نظر آئی، وہ بغاوت کی اور سر سے کفن باندھ کر چلنے کی راہ تھی۔ سلطنت کے زوال نے مسلمان کو جس نفسیاتی زیاں کے احساس میں مبتلا کیا تھا، اس سے زیادہ ٹھوس اور واضح وہ زیاں تھا، جو اسے ہر قدم پر معاشی زندگی میں محسوس ہو رہا تھا۔ درباروں کی بے چارگی اور بے اثری نے ملازمت، تجارت، صنعت و حرفت، علم، ادب، فن اور زمینداری، غرضیکہ کسب معاش کے جتنے وسیلے مسلمان کی دسترس میں تھے، نئے حالات میں ایک ایک کر کے ان سب پر اس کی گرفت ڈھیلی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اور مسلمان انگریز کو اس صورتِ حال کا ذمہ دار سمجھ کر اس کے خلاف غم و غصے اور نفرت کے جذبات کو پرورش دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء آ گیا۔ بغاوت کی آگ بھڑکی اور دیکھتے دیکھتے اس نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ملک کے مختلف گوشوں میں بغاوت کی تنظیم ہوئی۔ لیکن اس کا انجام

آخر شب کی بھڑک کر خاموش ہو جانے والی شمع کا انجام ثابت ہوا اور یہ عبرت ناک انجام مسلمانوں کی تباہی کا پیش خیمہ بن کر آیا۔

مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کی آخری علامت مغل بادشاہ کی ذلت، رسوائی، غریب الوطنی، فلاکت اور بے کسی کی موت ۔ مسلمانوں پر بغاوت کا سارا بار، ان کے لیے دار و رسن کی اذیتیں جائدادوں کی ضبطیاں، معاشی بدحالی اور اس صورت حال سے پیدا ہونے والی نومیدی جاوید شکستہ دلی اور شکستہ پائی، ذہن ماؤف، قلب افسردہ، روح بے چین اور ہاتھ پیر شل۔ مسلمان اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں مایوسیوں اور محرومیوں کے باوجود کسی نہ کسی رہنما کی قیادت اور ہدایت کے سہارے نئی زندگی پاتا اور تازہ دم ہو کر آگے بڑھتا رہا تھا۔ حوادث کو برداشت کرنے اور ان کا مقابلہ کرنے کی سکت اس میں ختم کبھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن غدر کے بعد کے مسلمان کی زندگی پچھلے ہر دور کے مسلمان سے مختلف تھی۔ آگ ٹھنڈی ہوتے ہوتے چنگاری بنی اور بالآخر مسلمان ایک راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گیا۔ انفرادی طور پر بے کس اور بے بس اور اجتماعی طور پر مجبور اور لاچار۔ سیاست، معاشرت، معیشت ہر بساط پر مسلمان کی حالت ہارے ہوئے کھلاڑی کی تھی۔ کھیل اب بھی جاری تھا۔ انگریز اور ہندو ایک طرف اور مسلمان دوسری طرف۔ غدر کے زمانے میں انگریز کے جان اور مال کو جو نقصان پہنچا، اس کی ساری ذمہ داری اس نے مسلمان پر ڈالی۔ ہندو جس نے کئی نسلیں مسلمان کا محکوم رہ کر گزاری تھیں، اس کے زوال آمدہ زندگی کو دیکھ کر بغلیں بجا رہا تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر انگریز کے دل میں جگہ کرنے اور مسلمان کو بے وفا قرار دے کر اپنی وفاداری کا یقین دلانے کو اپنا وتیرہ بنایا۔ مسلمان کو معاشی پریشانی میں مبتلا دیکھ کر اس نے اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ مسلمان کے لیے یہ صورت حال انتہائی تشویش ناک تھی۔ سرکار دربار میں وہ غیر معتبر تھا اور اس پر ہر طرح کی ملازمتوں کے دروازے بند تھے۔ ہندو کی لاتعلقی نے اسے کاروباری زندگی میں بے وسیلہ چھوڑ دیا تھا۔ جائدادیں، ریاستیں، جاگیریں اور املاک بحق حکومت ضبط۔ سونا، چاندی، زیور، اور جواہر پر مہاجن کا قبضہ۔ مسلمان نے اب تک جس زیان کا تلخ مزا چکھا تھا، وہ دینی اور اخلاقی احساس کا زیاں تھا یا معاشرتی اور تہذیبی اقدار کا۔ اس نے روح کا زوال دیکھا تھا۔ دل کی قوتوں کی شکست دیکھی تھی لیکن اس

کے پیٹ پر اس سے پہلے ایسی چوٹ نہیں پڑی تھی جس سے اسے غدر کے بعد سابقہ پڑا۔

امت مسلمہ پر ایسا عجب وقت اس سے پہلے نہیں پڑا تھا۔ دین۔ اخلاق، دھن، دولت، علم و دانش، عزم، یقین، آرزو، جستجو۔ انسان جن چیزوں کے سہارے جیتا ہے، ان میں سے ایک بھی اب اس کے قبضہ قدرت میں نہ تھی۔ تمنّاؤں کے لشکر میں گھرے ہوئے مسلمان کے لیے بس دو راہیں تھیں۔ ایک شکستہ پائی کی راہ، جس پر چل کر وہ آسمانوں کے ستاروں کے خالق اور زمینوں کے شب زندہ داروں کے معبود سے اپنی امیدیں، آرزوئیں، امنگیں اور جستجوئیں واپس مانگے۔ اور دوسری حقیقت پسندی اور حقیقت نگری کی راہ کہ جسے اختیار کیے بغیر نہ کھوئے ہوئے وقار اور چھنی ہوئی دولت کا حصول ممکن تھا، نہ پیٹ کی طلب کی تسکین۔ اور اس لیے مسلمان کو اس وقت ایسے رہنما کی ضرورت تھی جسے صید اور صیاد، حاکم اور محکوم، جابر اور مجبور کے رشتے کا صحیح ادراک ہو، جو انگریز کو بتا سکے کہ اس سے کہاں بھول ہوئی ہے اور مسلمان کو دکھا سکے کہ اس کا راستہ کون سا ہے۔ وہ ایک کی بدگمانی کو دور کرے اور دوسرے کے خوف اور شبہ پر قابو پائے۔ یہ دونوں کام انیسویں صدی کے نصف آخر کے سب سے بڑے رہنما، سب سے بڑے میر کارواں اور نشاۃ ثانیہ کے روشن دماغ اور روشن ضمیر ہادی سید احمد خاں نے انجام دیے۔

نڈر اور بے خوف ہو کر سید احمد خاں نے ایک طرف انگریز سے مخاطب ہو کر اسے بتایا کہ غدر کی ذمہ داری مسلمان پر کم اور اس کے حاکم پر زیادہ عائد ہوتی ہے، جس نے دل داری کے تقاضے پوری کرنے میں کوتاہی کی اور محکوم کے دل میں اپنی جگہ نہیں بنائی۔ اس نے انگریز کو مسلمان کی بے گناہی اور وفاداری کا یقین دلایا اور یوں اسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مسلمان کو اپنے قریب آنے کا موقع دے۔ مسلمان کا سینہ انگریز کے مظالم کے تیروں سے چھلنی تھا۔ وہ اسے اپنے دین کا اور اپنی عزت و خودداری کا دشمن سمجھتا تھا۔ یہ کرب ناک احساس اس کے دل میں پرورش پا رہا تھا کہ انگریز نے اس کی معیشت کے سارے وسیلوں پر پہرہ بٹھایا ہے۔ اس نے اس کی ملازمت کو اپنے احساس نفس کی ذلت اور اس کی لائی ہوئی تعلیم کو اپنے دینی عقائد کے خرمن کی برق سمجھنے کی عادت ڈالی تھی اور سرسید کی بصیرت اس پر یہ بات واضح کر چکی تھی کہ مسلمان کی فلاح صرف اس میں ہے کہ وہ انگریز کے قریب آ جائے۔ اسے اپنی وفاداری کا یقین دلائے۔ اس کے لائے

ہوئے علم کو اپنی کھوئی ہوئی دولت سمجھ کر اس سے رشتہ جوڑے۔ انگریز کی ملازمت کر کے معاشی سہولت اور معاشرتی وقار حاصل کرے۔

سرسید کے اخلاص و ایثار نے، اس کی حق بینی اور حق گوئی نے، اس کی واضح منطق اور موثر استدلال نے انگریز کو بھی قائل کیا اور مسلمان کو بھی۔ انگریز کے دل نے یہ بات قبول کی کہ غدر تنہا مسلمان کی ذمہ داری نہیں، اس آگ کو ہندو نے بھی بھڑکایا اور خود اس کی حاکمانہ بے تدبیری نے بھی۔ اس نے مسلمان کو سمجھا اور اسے آہستہ آہستہ اپنے قریب آنے کا موقع دیا اور مسلمان نے سرسید کی بتائی ہوئی راہ پر چل کر اپنی ذات کا احساس کیا، انفرادی ذات آہستہ آہستہ اجتماعی ذات میں ضم ہوئی اور بکھرے ہوئے ہجوم نے پھر ایک کارواں بن کر آگے بڑھنا شروع کیا۔

سرسید کی تحریک انیسویں صدی کے نصف آخر میں مسلم نشاۃ ثانیہ کی تحریک بنی۔ اس تحریک نے قرون وسطیٰ کے اسلام اور عہد نو کے تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے والے اسلام کے امتزاج سے ایک نئے عہد کی تخلیق کی۔ یہ عہد ہندی مسلمانوں کی قومی وحدت کے احیا کا عہد ہے۔ یہ عہد ان کے سیاسی مسلک کے تعین کا عہد ہے۔ یہ عہد ایک نئے علمی شعور اور قومی اور ملی ادراک کا عہد ہے۔ سرسید نے مسلمان کی زندگی کے ہر شعبے میں ہدایت کی مشعل روشن کی۔ اس مشعل کی روشنی میں مسلمان نے اپنے آپ کو ایک جداگانہ سیاسی وحدت کی صورت میں منظم دیکھا۔ اسے اپنے ذہن کے دریچے ہر نئے علم کے لیے کھلے دکھائی دیے۔ اس کی دین داری اسے اوہام کے قیدو بند سے آزاد نظر آئی اور اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اسے اس کے ماضی نے ایک ایسی زبان عطا کی ہے، جو اس کی آرزوؤں کی اور اس کے عزائم کی ترجمان ہے۔

قوموں کی کشتیوں کو طوفانوں کی زد سے بچانے والے ناخداؤں کو زمانے کی طرف سے جو جو انعام ملتے ہیں، وہ سرسید کو بھی ملے۔ قدردانی کی آخری حد یہ ہے کہ انھیں ملحد اور کافر بھی کہا گیا۔ لیکن مخالفتوں کے طوفانوں کی پروا کیے بغیر قوم کا یہ ہادی اپنی بات کہتا اور اپنا کام کرتا رہا۔ اس نے اپنے خلوص اور دل سوزی کا نتیجہ خود اپنی زندگی میں دیکھ لیا لیکن اس سے بھی زیادہ اور بہت زیادہ وہ ہے جو اس کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ظاہر ہوا۔

سرسید نے اپنے پیچھے اپنی کئی نشانیاں چھوڑیں۔ مسلک پر ایمان رکھنے والوں کی ایک سوچنے اور عمل کرنے والی جماعت، اپنے تعلیمی نصب العین کو زندگی بخشنے والی ایک درس گاہ اور اپنے اصلاحی افکار کو ابدیت بخشنے والے تہذیب الاخلاق کے اوراق۔

سرسید کے انتقال کے کم و بیش پچاس سال کے بعد مسلمانوں نے جس مملکت کی طرح ڈالی، وہ حقیقت میں سرسید کے دیکھے ہوئے خوابوں کی تعبیر ہے۔ اور اس خواب کو حقیقت بننے کی راہ سرسید ہیں دکھا گئے تھے۔ ایک دل شکستہ اور بکھرے ہوئے ہجوم کو کارواں کی شکل بھی سرسید نے دی۔ اور اس کی منزل کی نشاندہی بھی انھوں نے کی۔ سرسید بلاشبہ ہندی مسلمان کے دور جدید کے نشاۃ ثانیہ کے سب سے پہلے رہبر اور سب سے موثر راہنما ہیں۔

(ریڈیو پاکستان کے شکریے کے ساتھ)

مسلمانوں کے عقائد و افکار

ازامام ابوالحسن اشعری ۔ ترجمہ مولانا محمد حنیف ندوی

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری کے جلیل القدر عالم علامہ ابوالحسن اشعری کے شاہکار "مقالات الاسلامیین" کا ترجمہ ہے۔ اس میں علامہ نے چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے تمام عقائد و افکار کو بغیر کسی تعصب کے بیان کر دیا ہے، جو صدیوں ہمارے ہاں فکری و کلامی مناظروں کا محور بنے رہے۔ اس کے مطالعہ سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے نفسیات، اخلاق اور مادہ و روح کے بارہ میں کن کن علمی جواہر ریزوں کی تخلیق کی ہے، وہاں یہ حقیقت بھی نکھر کر سامنے آجائے گی کہ ماضی میں فکر و نظر کی کجی نے کن کن گمراہیوں کو جنم دیا ہے اور ان گمراہیوں کے مقابلے میں اسلام نے کس معجزانہ انداز سے اپنے وجود کو برقرار رکھا ہے۔ قیمت ۹ روپے

اس کتاب کا دوسرا حصہ زیر طباعت ہے اور عنقریب شائع ہو رہا ہے۔

ملنے کا پتہ

سیکریٹری ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور